سید منظور الحسن برکاتی

فن تحقیق و تنقید کا گوہرِ شب چراغ
محمود شیرانی!

راجستھان کی دور افتادہ، علم پرور، مردم خیز، سرزمین ٹونک کو جن محمود مسعود ہستیوں پر فخر و ناز ہے۔ اور جن کی وجہ سے اس کا تاج فخر آج تک تاباں و درخشاں ہے ان میں ایک قابل فخر و ناز ہستی پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کی بھی ہے۔

یہ محمود ہستی، ٹونک کی ان باکمال و فاضل ہستیوں میں سے ایک تھی جن کے علمی کارناموں کی شعاعیں ابھی تک پرتو فگن ہیں۔ اور جو پیوندِ خاک ہو جانے کے بعد بھی زندہ ہے۔

ٹونک کی یہ سرمایۂ ناز ہستی، یورپ اور ہند کے مختلف علمی سرچشموں سے سیرابی حاصل کر کے پنجاب کی علم پرور، زرخیز، گل ریز و گل بیز سرزمین میں ایک شجر سایہ دار و ثمر بار بنی، تعلیمی، تحقیقی تصنیفات و تالیفات سے چمنستانِ تحقیق کو آراستہ و پیراستہ اور سدا بہار بناتی رہی۔ تحقیق و تنقید کے گلشن میں اس کے گوہر بارِ قلم نے ایسے ایسے پھول کھلائے۔ کہ دنیائے ادب، ان کے رنگ و بو کی نیرنگیوں اور خوشبوؤں سے مست و سرشار ہو کر رہ گئی۔

تحقیق و تنقید کا یہ رنگ ڈھنگ، یہ اسلوب و انداز دیکھ کر بڑے بڑے اہل قلم انگشت بدنداں نظر آنے لگے۔ اس کے طرزِ تحریر و طرزِ تحقیق، دقتِ نظر اور تبحر آثارِ تاریخی کے قائل ہو گئے انھیں بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ یہ تازہ وارد بساطِ ادب، میدانِ تحقیق و تنقید میں ایک روز صف شکن اور مردِ میدان ثابت ہو گا ؎ نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد۔

یہ اپنے نام کی مناسبت سے "محمود غزنوی" کی طرح "پرانے نظریات" اور ادبی و تاریخی مسلّمات کے تراشیدہ بتوں کو اپنے تیشۂ قلم سے پاش پاش کر کے رکھ دے گا۔ اس کا سحر نگار و طاقت ور قلم غزنوی کی شمشیر خارا شگاف کی طرح ادب کے جس میدان میں بھی چلے گا۔ اس کو فتح کر کے ہی چھوڑے گا۔

شیرانی محمود اور غزنوی محمود میں یہی مماثلت ہے جو دونوں کو اپنے اپنے میدان میں ممتاز بنائے ہوئے ہے۔ میدان کارزار جس طرح محمود غزنوی کے ہاتھ رہا۔ اسی طرح میدان تحقیق و تنقید محمود شیرانی کے زیر قلم و زیر نگیں ۔ !

شیرانی صاحب نے اپنے قلم سے جو جادو جگائے ہیں اور علم و فن کے جس بھی میدان پر راہنما خطوط اور نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ آج دوسروں کے لئے روشنی کے ایسے مینار، اور راستوں کے ایسے چراغ جن کی راہ نمائی سے طالبان علم و تحقیق کی کشتیاں ہمیشہ پار اترتی رہیں گی اور جن سے راہ نوردان علم و فن، نیز تازہ واردانِ بساطِ ادب ہمیشہ اکتساب نور کرتے رہیں گے۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی ایک ایک سطر تشنہ کامان ارباب ذوق کے لئے آب حیات کا جام ثابت ہوگی۔

انھوں نے فنِ تحقیق کی وہ وہ خدمتیں انجام دی ہیں۔ جو دوسروں سے دشوار تھیں۔ جو شخص بھی ان کی تصانیف اور مضامین کو بنظر انصاف دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ معلومات کا ایک سمندر تھے۔ علمی جواہرات کو وہ تودۂ گمنامی و بے نشانی سے نکالتے تھے اور پھر حسن ترتیب کے جملہ لوازم سے آراستہ کر کے دنیا کی مشتاق نگاہوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔

وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہ تک پہنچتے۔ اور اس کے "مالہٗ و ماعلیہ" کے سراغ میں پتے پتے اور ڈال ڈال پھرتے۔ اور پتال تک کی خبر لاتے تھے۔ وہ بڑے جامع کمالات اور دقیق النظر محقق تھے۔ ان کا زیادہ وقت تعلیم و تعلم، تحقیق و تجسس، مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا تھا اور ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم و ادب کی خدمت کے لئے وقف تھا۔

انھیں نادر و نایاب کتابیں اور قدیم بادشاہوں، راجاؤں اور نوابوں کے سکے جمع کرنے

کا بھی بے حد شوق تھا۔ اور یہ شوق ان کو نہ صرف ہندوستان کے پرانے شہروں میں بلکہ انگلستان تک لے گیا۔ اور اس سلسلہ میں وہاں کے مستشرقین سے بھی ان کے تعلقات قائم ہوئے پیرس کے قومی کتب خانے سے بھی انھوں نے استفادہ کیا۔ اور وہاں تقریباً تین ماہ مصروف رہے۔ اور وہیں بعض فرانسیسی اہل علم کے ساتھ مل کر قلمی کتابوں، تصویروں، اور سکوں کی تجارت بھی کی اس طرح انھیں مشرق و مغرب دنیا کے دونوں حصوں میں قیام کا موقع ملا۔

تاریخی تنقید، کے سلسلہ کا ان کا سب سے پہلا مضمون، علامہ شبلیؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف "شعر العجم" کی تنقید ہے۔ جو ان کی وسعت نظر، وسعت تحقیق، فراوانیٔ معلومات، خداداد علمیت ذہانت اور ژرف نگاہی پر دلالت کرتا ہے۔

اس مضمون کی اشاعت نے علمی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا اس مضمون سے شیرانی کا مقصد علامہ شبلیؒ کی تنقیص نہ تھا۔ بلکہ تاریخی و تحقیقی تسامح اور غلطیوں کی جانب توجہ دلانا تھا۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں :۔

"میں نہایت وثوق سے عرض کرتا ہوں۔ کہ تنقید ہٰذا، مولانا شبلی مرحوم کی علمی فضیلت کی منقصت نہیں ہے۔ بلکہ محض احتجاج ہے اس مروجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔

ہم تاریخی واقعات اور سوانح لکھتے وقت اس قدر تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ کہ ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں۔ اور ان کی صحت و درستی کے متعلق اطمینان کر لیں ۔۔۔"

(پیش کلام صف الف)

"تنقید شعر العجم"

"تنقید شعر العجم" کے بعد ان کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق کتاب "پنجاب میں اردو" ہے یہ ان کا ایک عظیم الشان تحقیقی کارنامہ ہے جس نے ان کو لازوال شہرت اور محققین و مورخین کے

حلقے میں غیر معمولی امتیاز و تفوق بخشا ہے۔

اس کتاب میں پروفیسر صاحب نے بتایا ہے۔ کہ زبان اردو نے اپنا ابتدائی اور ارتقائی دور، پانچ دریاؤں والی سرزمین میں گزارا ہے۔ ابتدائی اردو کو پنجابی سے بہت کچھ مماثلت و مناسبت ہے

شیرانی صاحب کا ایک اور کارنامہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک مضمون انتہائی تحقیق کے بعد "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" کے لئے بھی لکھا تھا۔ جو بہت ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔

اسی طرح کی ایک اہم خدمت "میر قدرت اللہ قاسم" کے تذکرۂ شعرائے اردو، "مجموعۂ نغز" کی تصحیح و اشاعت ہے۔ جس کو مرحوم نے بڑی کاوش و محنت اور جانفشانی سے ایڈٹ کیا تھا۔ اور پہلی مرتبہ پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے چھپا تھا۔

اس تذکرۂ شعراء کی اہمیت و افادیت، اور شیرانی صاحب کی دیدہ ریزی و کاوش اور ان کی تحقیقی خدمت کی فضیلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اس پر سب سے پہلے تبصرہ علامہ اقبال نے فرمایا:۔

"ہندوستان میں اس سال کی قابل ذکر بلکہ قابل فخر اشاعات میں سے حکیم میر قدرت اللہ قاسم کی تصنیف "مجموعۂ نغز" ہے .....

اگرچہ ظاہری صفات میں بھی کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد کی دیدہ زیبی کے لحاظ سے "مجموعۂ نغز" ہماری ستائش کی حقدار ہے۔ لیکن جس چیز نے اس کو نغز تر بنا دیا۔ وہ اس کے فاضل مرتب حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کی دقت تحقیق ہے حافظ صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں۔ ان کے علمی مضامین، ارباب ذوق سے ان کو اچھی طرح روشناس کرا چکے ہیں۔ اردو فارسی ادب کے وہ مشہور محقق ہیں۔ اور ان کی تحقیقات کا معیار نہایت بلند تسلیم کیا جا چکا ہے۔ "مجموعۂ نغز" کی ترتیب و تصحیح میں انھوں نے اس جانفشانی اور دقت نظر سے کام لیا ہے

جس کے لئے وہ مشہور ہیں:۔"

رسالہ کاروان۔ مرتبہ مجید ملک لاہور

دسمبر ۱۹۳۳ء

ان تصنیفات و تالیفات کے علاوہ انھوں نے "پرتھی راج راسو" "فردوسی پر چار مقالے" اور دوسرے مختلف ادبی، تاریخی اور تحقیقی مضامین بھی بکثرت لکھے ہیں۔ جو اورینٹل کالج میگزین لاہور، رسالہ زمان، خیالستان اور رسالہ مخزن وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین "مقالات شیرانی" کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی چھپے ہیں۔

غرض کہ شیرانی صاحب نے اپنی وقت نظر اور تحقیق و تفحص سے جو تخلیقات بھی پیش کی ہیں۔ ان کا رتبہ دنیائے ادب میں نہایت بلند ہے۔ اور ان کا تبحر علمی، ذوق تنقید، نکتہ رسی و ژرف نگاہی ارباب علم کے نزدیک مسلّم ہے۔ اور بقول علامہ سید سلیمان ندوی:۔

"ان میں سے ہر مضمون، طالب تحقیق کے لئے معلوت کا خزانہ ہے۔ ان کے مضامین میں بہت سی مشہور عام باتوں کی تصحیح و تنقید ہے۔ یا گزشتہ سرمایہ معلومات میں مزید اضافہ ہے۔" (رسالہ معارف اعظم گڑھ)

شیرانی صاحب کے علمی وقار اور تحقیقی نظر کا نہ صرف ہندوستان کے چوٹی کے ادیب اعتراف کرتے آئے ہیں۔ بلکہ انگلستان و فرانس میں بھی ان کی تلاش و جستجو اور تحقیق و تجسس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ چنانچہ اویس احمد ادیب لکھتے ہیں۔ کہ

انگلستان جانے کے وقت تک انہماک اتنا تو نہیں تھا۔ جتنا کہ بعد میں ہوا۔ مگر وہاں کے قیام نے اس انہماک کو زبردست قوت بخشی۔ ان کے اس زمانہ حیات سے ایک دلچسپ واقعہ وابستہ ہے جس کا بیان یہاں غیر مناسب نہ ہوگا۔

قیام انگلستان کے زمانے میں انھیں ایک انگریز ڈاکٹر ہنری اسٹیپ کی ایک ایسی کتاب مل گئی تھی جو اس وقت تک شائع نہیں ہوئی تھی اور نہ انگریزی

پریس اسے شائع کرنے کو تیار تھا - کیوں کہ اس کی اشاعت سے عوام پر برے اثرات مرتب ہونے کا خیال تھا - وہ برے اثرات یہ تھے - کہ لوگوں کو اسلام کے محاسن معلوم ہو جاتے - اور عیسائیت کے عیوب ظاہر ہو جاتے

مولانا محمود شیرانی نے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ لگا کر اس کو شائع کرنا چاہا - مگر اپنے آپ کو اس کے اخراجات کا کفیل نہ پا کر، انھوں نے نہ صرف انگلستان میں چندہ کیا - بلکہ مصر اور ترکی سے بھی چندے کی اپیل کی - اسلامی ممالک نے بھی ان کی آواز پر سکوں کی بارش کر دی -

اس کتاب کے شائع ہوتے ہی نہ صرف انگلستان میں بلکہ تمام انگریزی داں دنیا میں ہنگامہ برپا ہو گیا - ہنگامہ بھی ایسا تھا - کہ محمود شیرانی کو جھوٹا بتایا گیا - بعض اخبارؤں نے تو غیر ذمہ دارانہ طور پر یہ بھی لکھ دیا تھا - کہ ڈاکٹر ہنری اسٹیپ کوئی شخص ہی نہیں تھا - یہ کتاب محمود شیرانی کی تالیف ہے اور انھوں نے یہ فرضی نام رکھ لیا ہے -

مولانا اس سے پریشان نہیں ہوئے - بلکہ انگریزی پریس کی اس زہر افشانی کو اپنے لئے فال نیک سمجھا - اور اس کے بعد ایک مختصر سی کتاب، اس کتاب کے تعارف کے طور پر لکھی - جس سے دنیا کو یہ اندازہ ہو گیا - کہ محمود شیرانی دنیا کی کسی طاقت سے ڈرنے والے نہیں -

یہی مولانا کا اولین کارنامہ تھا - اور اس کی بدولت نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں نے حافظ محمود شیرانی کو جانا -"

(رسالہ "آجکل" یکم فروری ۱۹۴۷ء)

شیرانی صاحب مرحوم کے بزرگ "کھاٹو" ضلع ناگور مارواڑ راجستھان کے رہنے والے تھے اور حضرت سید احمد شہید رح کی تحریک میں شامل رہے تھے - ان کے مریدین خاص میں شمار کئے جاتے تھے - ان کے دادا حاجی چاند خاں قصبہ شیران کے ذی وجاہت اور متمول و ممتاز فرد تھے -

ان کے والد منشی اسماعیل خاں، ٹونک کے دوسرے فرماں روا نواب وزیر الدولہ مرحوم کے عہد میں ٹونک آئے تھے۔ اور یہاں ہی توطن اختیار کرلیا تھا۔ ٹونک کے محلہ مہندی باغ میں اپنے خاندان کی رہائش کے لئے پختہ مکانات تعمیر کرائے تھے جو ۱۹۴۷ء تک اسی خاندان کے افراد کے قبضہ میں رہے۔ لیکن جب اس خاندان کے تمام ہی افراد پاکستان منتقل ہوگئے تو یہ مکانات محکمہ کسٹوڈین کی تحویل میں چلے گئے۔ اور آج ان مکانات میں سندھی آباد ہیں

منشی محمد اسماعیل خاں نے دو شادیاں کی تھیں۔ زوجۂ اول کے بطن سے دو لڑکے ابراہیم خاں اور اسرائیل خاں، تین دختران، زبیدہ بی، زہرہ بی، اور خاتون بی تھیں۔ اور زوجہ دوم کے بطن سے پانچ فرزند تولد ہوئے۔ محمود خاں، مسعود خاں، مودود خاں، مقصود خاں، اور مشہود خاں۔

حافظ محمود خاں ان کے بڑے فرزند تھے۔ انھوں نے بھی دو شادیاں کیں۔ اردو کے مشہور شاعر رومان، حضرت اختر شیرانی، زوجۂ اول کے بطن سے تھے جو شیرانی خاندان ہی سے تعلق رکھتی تھیں

ٹونک کے چوتھے نواب محمد ابراہیم علی خاں خلیل کے عہد سریر آرائی میں ۵ نومبر ۱۸۹۵ء کو حافظ محمود خاں شیرانی پیدا ہوئے اور علمی شیفتگی کے ماحول میں پلے بڑھے۔

ٹونک اس وقت شعر و ادب اور علم و حکمت کا چمنستان بنا ہوا تھا۔ بسمل خیر آبادی مضطر خیر آبادی، اسد لکھنوی اور ظہیر دہلوی جیسے سخنوران کامل کی شعری نوا سنجیوں سے یہاں کی فضا معمور تھی۔ حضرت علامہ حکیم سید برکات احمدؒ، حضرت مولانا نصیر احمدؒ، مولانا حیدر حسن خاں، حضرت مولانا محمود الحسن خاں صاحب معجم المصنفین، مولانا خلیل الرحمٰن، مولانا عبد السلام خیال، مولانا سید اصغر علی آبرو، مولوی علی اصغر ناظم، امام الشعراء حضرت کیف تلمیذ اسد لکھنوی، جانشین داغ وحالی صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق، مولانا احمد علی سیماب جیسے علماء، فضلاء اور شعراء و ادباء ٹونک کے علمی ادبی افق پر تاباں و درخشاں تھے۔ اور ان کی ضوفشانی سے سرزمین ٹونک صدر شک مہ و انجم بنی ہوئی تھی۔

دستور قدیم کے مطابق شیرانی صاحب نے تعلیم کی ابتدائی منزلیں گھر ہی پر طے کیں۔ گھر کا

ماحول مذہبی اور دینی تھا۔ سب سے پہلے حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی اور اپنی اور اپنے والدین کی بخشش کا سامان فراہم کیا۔ اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

ٹونک، علماء و شعراء کا مرجع و مرکز ہونے کے ساتھ حفظ قرآن کا بھی منبع تھا۔ یہاں حفظ قرآن کا بڑا چرچا تھا خود فرماں روائے ٹونک حافظ کلام الٰہی تھے۔ شہر کا کوئی گھرانا ایسا نہ تھا جہاں گھر کے افراد کی اکثریت حفظ قرآن کی دولت سے بہرہ ور نہ ہو۔

ابتدائی تعلیم کے بعد شیرانی صاحب کو ان کے والد نے دربار ہائی اسکول میں داخل کر دیا جہاں انگریزی تعلیم کے ساتھ مشرقی زبانوں کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے فارسی امتحانات منشی، منشی فاضل کا ٹونک سینٹر تھا۔ اور نائب الریاست صاحبزادہ عبیداللہ خاں اس کے سپرنٹنڈنٹ امتحانات تھے۔

حسن مرزا دہلوی، جو انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ادبیات فارسی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ وہ اس زمانے میں اِس اسکول کے پرنسپل تھے۔ ٹونک کے مشہور فارسی زبان و ادب کے عالم منشی محمد یوسف خاں جو اس وقت تعلیمی مراحل سے گزر رہے تھے۔ شیرانی صاحب کے کلاس فیلو تھے۔

شیرانی صاحب کو تعلیم کے ساتھ بچپن ہی سے شکار اور فنون سپہ گری کی تحصیل کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے اس دوران تعلیم میں شہ سواری اور فنون سپہ گری کی تربیت بھی حاصل کی۔

انھوں نے اگرچہ ٹونک میں باکمال اساتذہ سے تحصیل علم کی تھی اور ادبیات فارسی میں ٹونک ہی میں اچھی استعداد حاصل کر لی تھی لیکن ان کی تشنگیٔ علم ہنوز باقی تھی۔ وہ باقاعدہ منشی فاضل کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے ٹونک سے لاہور چلے گئے۔ جہاں اس وقت ٹونک کے مشہور عالم مولوی مفتی عبداللہ مرحوم قیام پذیر تھے چنانچہ ان کے توسط سے آپ نے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اور منشی فاضل کا امتحان اعلیٰ درجہ میں پاس کیا۔

ٹونک میں آپ نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان میں حسن مرزا دہلوی، پرنسپل

دربار ہائی اسکول، ان کے بھائی محمد سعید دہلوی، ہیڈ ماسٹر دربار ہائی اسکول، اور حکیم سید سعید احمد اسعد مرحوم، کے اسمار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حکیم سید سعید احمد اسعد نہ صرف ایک حاذق طبیب تھے۔ بلکہ فارسی زبان و ادب کے بھی بڑے رمز شناس عالم تھے۔ بصارت کی ظاہری روشنی سے اگرچہ ان کی آنکھیں محروم ہو چکی تھیں لیکن ان کی "چشم بصیرت" علوم و فنون پر وا تھیں اور وہ "نابینا" ہونے کے باوجود "دانا و بینا" تھے اور درس و تدریس کے سلسلے کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

"منشی فاضل" پاس کرنے، اور انگریزی میں اچھی دستگاہ حاصل کرنے کے بعد انھیں ہندوستان سے باہر جانے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ روشن خیال باپ کے چہیتے فرزند تھے دوسرے بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین تھے اس لئے باپ انھیں بہت مانتے تھے۔ باپ نے ہونہار فرزند کے شوق ترقی، بلند حوصلگی کی قدر کرتے ہوئے انگلستان روانہ کر دیا۔ یہ ۱۹۰۴ء کی بات ہے اس وقت ان کی عمر چوبیس ۲۴ سال تھی۔

ڈاکٹر اویس احمد ادیب، رسالہ آجکل دہلی یکم فروری ۱۹۴۷ء میں "شیرانی صاحب" کے سوانحی حالات لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"اس سلسلہ میں یہ ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ حافظ محمود شیرانی پہلے ایسے ہندوستانی فرد تھے جو راجپوتانے کی سرزمین سے نکل کر انگلستان گئے۔"

شیرانی صاحب کا یہ سفر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے تھا۔ اور وہ پوری توجہ اور دلچسپی سے اس کی تحصیل میں مصروف تھے۔ اور رومن لاء، کریمنل لاء، کنسٹیٹیوشن لاء، نیز لیگل ہسٹری کے امتحانات میں یکے بعد دیگرے کامیابی حاصل کی۔ لیکن وہ ابھی اس کی تکمیل نہ کرنے پائے تھے۔ اور لندن میں ان کے قیام کو پورے دو سال بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ ۱۹۰۶ء میں ان کے پدر بزرگوار نے رحلت کی اور خانگی حالات کے پیش نظر فوری طور پر ہندوستان آنا پڑا لیکن وہ یہاں بھی زیادہ دن نہ رہے اور بہت جلد واپس چلے گئے۔ اس مرتبہ جب لندن گئے۔ تو

اپنے چھوٹے بھائی مشہود خاں کو بھی ساتھ لے گئے جنھوں نے مستقل طور پر لندن ہی میں اقامت اختیار کر لی۔

انگلستان میں تعلیمی مشاغل کے ساتھ انھوں نے وہاں کی کئی علمی، ادبی سوسائیٹیوں میں بھی کام کیا۔ اور وہ ان کے سرگرم رکن رہے

لندن یونیورسٹی کے فارسی امتحان میں اول آنے پر انھیں آوزے اسکالرشپ ملا جس سے انھوں نے پروفیسر ٹی، ڈبلیو آرنلڈ کی رہنمائی میں ایک سال تک عربی زبان کا مطالعہ کیا ساتھ ہی اس کے مشہور لوزک فرم اینڈ کمپنی لندن میں بطور مشیر برائے اسلامی مخطوطات و آثار عتیقہ کام کرتے رہے حسن اتفاق سے وہاں علامہ اقبال، سر عبدالقادر اور بیرسٹر آصف علی جیسے مشاہیر وطن کی رفاقت بھی میسر آئی جو اس وقت علامہ، سر اور بیرسٹر نہیں ہوئے تھے بلکہ شیرانی صاحب کی طرح طالب علمانہ زندگی گزار رہے تھے۔ یہ سب بھی شیرانی صاحب کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔

تصنیف و تالیف کا سلیقہ، اور تحقیقی مضامین کی ترقیم و تحریر کا ہنر شیرانی صاحب نے انگلستان کی طالب علمانہ زندگی ہی سے دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اور اسی زمانے سے علمی حلقوں میں ان کا نام ایک بالغ نظر محقق کی حیثیت سے لیا جانے لگا تھا

وہ لندن میں سات آٹھ سال رہے اور وہاں کے معاشرے کا غائر نظر سے مشاہدہ بھی کیا لیکن لندن کی حسین و رومانی و دلفریب فضا سے دامن کشاں ہی رہے۔ اور "درمیانِ قعرِ دریا" "تختہ بند" کئے جانے کے باوجود، دامن تر نہ کیا۔ بلکہ ہوشیار ہی رہے۔

اور یہ فیض تھا بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا، اور اس دینی ماحول کا جس میں انھوں نے اپنی زندگی کا ابتدائی تیسرا حصہ گزارا تھا۔ اور جہاں ان کی سیرت و کردار کی تعمیر ہوئی تھی۔

۱۹۱۴ء میں انھیں گھریلو ضرورتوں اور مشکلات کے باعث پھر ہندوستان آنا پڑا۔ اگرچہ وہ اس مرتبہ بھی واپس جانے ارادے سے آئے تھے لیکن جنگ عظیم کے چھڑ جانے کی وجہ سے وہ نہ جا سکے بلکہ ٹونک ہی میں مطالعہ اور تحقیقی مشاغل میں ۱۹۲۱ء تک مصروف رہے۔

اس سات سال کی مدت میں انھوں نے یہاں کے کتب خانوں کے نادر و نایاب ذخیرہ ہائے کتب سے استفادہ کیا اور کتابوں و سکوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں لاہور، لکھنؤ اور دوسرے مقامات کے سفر بھی کئے۔

پھر چونکہ قدرت کو انھیں منظر عام پر لانا تھا۔ اور عروس شہرت سے ہمکنار کرنا تھا۔ نیز اس چشمۂ فیض سے بہت سوں کی سیرابی مقدر تھی۔ منجملہ دوسرے اسباب کے ایک بڑا سبب یہ ہوا۔ کہ ٹونک کے انتظامی و سیاسی حالات میں انقلاب رونما ہوا۔ اور وہ پہلا پبلک احتجاجی ہنگامہ برپا ہوا، جو "مادھے والی" کے ہنگامے، یا "۱۹۲۱ء کے ہنگامے" کے نام سے ٹونک کی ریاستی تاریخ میں مشہور ہے۔

یہ واقعہ، یہ پبلک احتجاج اور یہ ۱۹۲۱ء ٹونک کے ریاستی دور کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم باب ہے۔ جس سے بہت سوں کے عروج و زوال کی داستانیں وابستہ ہیں اور جس کی طوفان انگیزیوں نے بڑے بڑوں کے ایوانِ عزت و جلالت کو لرزہ بر اندام کر دیا۔

کارکنانِ ریاست نے اپنے وقار کی خاطر، اس مظاہرے اور حقوق طلبی کی اس جد و جہد کو "خلافت تحریک" سے جوڑ کر انگریز اور ریاست سے بغاوت کا نام دے کر پوری قوت سے کچل دینے کا منصوبہ بنایا۔ اور یہاں کے عوام و خواص پر اس پردے میں مظالم کے پہاڑ توڑ دیے۔ شہر کے با اثر اور بڑے بڑے روا داروں اور عزت داروں، خاص طور سے ان لوگوں کے خلاف مقدمات قائم کئے گئے۔ جن کی آمد و رفت باہر کے شہروں سے رہتی تھی۔ یا جو روشن خیال تھے اور اخبار بینی کا ذوق رکھتے تھے مقدمات چلائے گئے اور انھیں جلاوطنی اور قید و بند کی سزائیں دی گئیں۔

جب ۱۹۲۱ء کی اس تحریک کے سلسلے میں دارو گیر، پکڑ دھکڑ اور جلاوطنی کا سلسلہ شروع ہوا تو پروفیسر صاحب اس سے متاثر ہو کر اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر لاہور چلے گئے۔

لاہور میں چونکہ وہ طالب علمی کا زمانہ گزار چکے تھے اور اس کے بعد بھی ان کی آمد و رفت، اور اکثر قیام لاہور میں رہتا تھا اس لئے وہاں کے علمی ادبی حلقے ان سے کافی حد تک متعارف تھے۔ اور

وہاں کے اصحاب علم و فن، ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اس لئے اب وہ جوں ہی لاہور مستقل قیام کے ارادے سے پہنچے تو وہاں کی علمی مجلسوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور وہ اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر بنا دئے گئے اس سے پہلے کچھ عرصے تک وہ اسلامیہ کالج لاہور سے بھی وابستہ رہے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

"یہ پہلی مثال ہوگی۔ کہ کاغذی سند کی سند پر نہیں بلکہ ان کی عالمانہ تحقیق کی مثالوں کی سند پر پنجاب یونیورسٹی نے اورینٹل کالج میں ان کو اردو کا پروفیسر مقرر کیا تھا۔" (رسالہ معارف اعظم گڑھ نمبر ۴ جلد ۵۰، اپریل ۱۹۴۲ء)

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی اعلیٰ قابلیت و صلاحیت اور حیرت انگیز وسیع معلومات، تحقیقی و تنقیدی مہارت کے باعث پروفیسری کے منصب کے لئے بہت ہی موزوں ثابت ہوئے انھوں نے اپنے فرض منصبی کو جس محنت و مستعدی، قابلیت اور ذوق و شوق سے انجام دیا۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ کالج کے طلباء میں جو علمی، ادبی اور تحقیقی و تنقیدی ذوق پیدا کیا۔ وہ انھیں کا کام تھا اور تعلیم کا اصل منشاء ذوق پیدا کرنا ہی ہے۔ پھر وہ اپنا راستہ نکال لیتا ہے۔

کالج کے وہ طلباء جو اس زمانے میں ان سے متعلق رہے وہ ان کی تنقیدی و تحقیقی رفعت و جلالت لسانی اور تاریخی معلومات اور انداز ابلاغ و افہام کے ہمیشہ مداح رہے تمام طلباء اور ساتھی لکچرار ان کے بڑے قدر شناس تھے اور ہمیشہ عزت و تکریم کرتے تھے۔

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس میں بو تیری　　خوشا وہ دشت کہ ہو جس میں جستجو تیری

لاہور کے دورانِ قیام، اور اسلامیہ کالج و اورینٹل کالج سے وابستگی کے زمانے میں شیرانی صاحب نے اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا تذکرہ اوپر آچکا۔ وہ ۱۹۴۰ء تک اورینٹل کالج سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد پیرانہ سالی کے باعث اس سے سبک دوشی حاصل

کرلی اور اپنی زندگی کے آخری حصے کو گوشۂ امن و عافیت میں بسر کرنے اپنی علمی اور تحقیقی شہرت و ناموری کو لئے ہوئے اسی بستی میں آگئے جہاں ان کا ضمیر بنا تھا - اور جس کی علمی فضا میں انھوں نے ہوش کی آنکھیں کھولی تھیں -

ٹونک آنے کے بعد انھوں نے شہر سے تین میل فاصلے پر بناس ندی کے کگر اج گھاٹ پر ایک قطعۂ زمین خریدا - اور وہیں اپنے خیالات کے مطابق چمن راحت کی آبیاری شروع کردی - باغ لگایا پھول کھلائے - اور ایک ایسی دنیا آباد کرلی - جہاں سکون تھا، راحت تھی، آرام تھا - اور اس کنج تنہائی میں اگر کوئی ان کا رفیق تھا - تو وہ ان کی محبوب کتابیں تھیں - یہی ان کی ہمدم و انیس اور یہی خیر جلیس :-

"فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے"

سنہ ۱۹۴۶ء کے فروری کی ۱۵ تاریخ تھی - اور رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی - کہ علم و ادب کا یہ مہر انور اور فن تحقیق کا یہ گوہر شب چراغ جس خاک سے اٹھا تھا اسی خاک میں روپوش ہوگیا - اور سرزمین ٹونک اپنی قابل فخر و ناز ہستی سے ہمیشہ کے واسطے محروم ہوگئی -

مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کو اسی باغ میں سپرد خاک کیا گیا - جو ان کا لگایا ہوا تھا - اور جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے - چنانچہ آج وہ اسی باغ میں آسودۂ خواب ہیں

اے خدا تو اسے اب نور سے کردے معمور
اس پہ ہوتا رہے دائم تری رحمت کا ظہور

ان کے فانی جسم نے مفارقت کی ہے - مگر ان کی ابدی زندگی انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گی اور ان کی گراں مایہ تحقیقی و تاریخی تصانیف ان کی یادگار رہیں - انھوں نے جو چراغ جلائے ہیں ان کی ضیا پاشی میں کبھی فرق نہ آئے گا - وہ اپنا چراغ زیست بجھانے سے پہلے کتنے ہی چراغ جلا گئے -

شیرانی صاحب سے قریبی تعلق رکھنے والے ان کے فضل و کمال کے قدر شناس اور ٹونک کے ماضی و حال سے باخبر، ٹونک کے ریاستی اور نوابی دور کے ممتاز عہدے دار ناظم مال جناب

مرزا مصطفےٰ بیگ صاحب

"محمود خاں ..... اپنے آخری زمانے میں ٹونک تشریف لے آئے تھے اور امیرانہ انداز سے رہتے تھے۔ ان کی سواری میں ذاتی بیل تانگہ رہا کرتا تھا۔ اور وہ ہر روز عصر کے وقت ندی بناس تشریف لے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ ٹونک سے باہر زمانۂ قیام میں ندی بناس کی یاد ضرور آتی رہی جس کی وجہ موصوف نے یہ بتائی تھی۔ کہ ایک وقت میں ایک ڈاکٹر ولیم ڈیسائی نام، ٹونک کے شفاخانے میں سرجن تھے۔ ان سے ان کی دوستی ہوگئی تھی اور یہ دونوں صاحب قریباً روزانہ بعد عصر بناس کے کنارے جاتے تھے۔ اور رات کے آٹھ نو بجے تک وہیں نشست رکھتے تھے۔

میری نظامت ٹونک کا زمانہ جولائی ۱۹۳۹ء سے شروع ہوا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی جناب محمود خاں صاحب کو مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

موصوف ذہین اور فہیم انسان تھے اور قدرت سے غیر معمولی دماغ لے کر آئے تھے اور صرف فارسی ہی کے عالم نہ تھے۔ بلکہ غور و فکر اور تحقیق کرنے والے انسان تھے اور یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ مجھ جیسے نالائق پر بہت ہی شفقت فرماتے تھے۔ اکثر عصر کے وقت نظامت کے دفتر کے اس بالائی کمرے میں تشریف لے آتے جہاں میری نشست تھی۔

وہ متوسط قد کے دبلے پتلے انسان تھے۔ رنگ بھی سانولا تھا اور لباس بھی خاص قسم کا نہ ہوتا تھا۔ ان سے ہر پڑھا لکھا آدمی مرعوب و متاثر ہوتا تھا۔ اور ان کی عزت و تعظیم کرتا تھا۔ وہ ایک بڑے آدمی تھے۔ باعتبار علم و فضل بھی ان کی بڑائی مسلم تھی۔ اور مالی حالت بھی بہت اچھی تھی۔

انھوں نے اپنے لئے ندی بناس کے ڈھاوے (کنارے) پر موضع سعید آباد

یا سرور آباد میں ایک قطعہ زمین خرید کر باغیچہ لگایا تھا۔ اور اپنے مزار کے لئے ایک جگہ پسند فرما کر وہ جگہ مجھے بتادی تھی۔ اور مجھ سے یہ وصیت فرمائی تھی۔ کہ اسی جگہ انھیں دفن کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

نماز جنازہ سرائے کی مسجد میں ادا ہوئی اور بذریعہ ٹرک ان کی میت وہاں پہنچائی گئی۔ کافی لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور میت کے ساتھ سرور آباد پہنچے اختر صاحب بھی موجود تھے۔"

شیرانی صاحب کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادہ گرامی شاعر رومان، اختر شیرانی تھے اختر کی تعلیم و تربیت کا انھیں بہت خیال رہتا تھا۔ وہ چونکہ لاہور میں رہتے تھے۔ اور اختر ٹونک میں۔ ان کی خواہش تھی۔ کہ اختر شیرانی کو زیادہ سے زیادہ علوم و فنون کی تعلیم حاصل ہو اور وہ آسمان علم و ادب پر اختر تاباں بن کر چمکیں۔

وہ جب ٹونک تشریف لاتے تو اختر کی تعلیمی رفتار ترقی کا جائزہ لیتے تھے۔ اس خیال کے تحت وہ اختر کو اپنے ہم درس قدیم، ساتھی اور دوست مولانا محمد یوسف خاں کے پاس لے گئے منشی یوسف خاں اس عہد کے ممتاز اور فاضل اساتذۂ ادب فارسی میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور ان کا حلقۂ درس بڑا مشہور تھا۔ چنانچہ شیرانی صاحب نے اختر شیرانی کو بھی اسی فاضل و عالم استاد کی خدمت میں پیش کر دیا۔

شاگردی کے اس واقعہ کو منشی یوسف خاں کے فرزند مولانا عبید اللہ خاں (جو ریاستی دور میں اور اس کے بعد راجستھان میں پولس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں اور اختر کے ساتھی، اور دوست ہیں) اپنے ایک انٹرویو میں اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"میرے والد منشی یوسف خاں مرحوم، اور اختر کے والد پروفیسر محمود خاں شیرانی میں دوستانہ تعلقات تھے۔ اور یہ تعلقات دربار ہائی اسکول کی تعلیم کے زمانے سے چلے آرہے تھے۔ میرے والد اسکول کی کرکٹ کی فرسٹ ٹیم کے کیپٹن تھے۔

اور پروفیسر صاحب اس کے ایک اچھے کھلاڑی،

ایک روز پروفیسر صاحب، داؤد خاں کو جو ابھی اختر نہیں ہوئے تھے لے کر میرے والد صاحب کے پاس تشریف لائے۔ اور ان کو فارسی کی تعلیم کے لئے میرے والد کی خدمت میں پیش کیا۔

اختر کی عمر اس وقت بارہ، تیرہ سال کی ہوگی۔ میں بھی اس وقت والد صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور پہلی مرتبہ اختر کو اور ان کے محمود خاں کو اسی روز دیکھا تھا۔

میں عمر میں اختر سے دو تین سال بڑا تھا۔ اور یہ زمانہ "مادھے والی" کے واقعہ سے جو غالباً ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا پہلے کا تھا۔

پروفیسر صاحب نے والد صاحب سے فرمایا۔ کہ آپ جانتے ہیں۔ میں تو لاہور میں رہتا ہوں۔ اور یہ میرا لڑکا داؤد ٹونک ہی میں ہے۔ اس کی تعلیم خاطر خواہ نہیں ہو رہی ہے۔ اب میں اس کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لایا ہوں۔ آپ اس کو اپنی شاگردی میں قبول فرمائیں۔"

چنانچہ ۱۹۲۱ء تک، اختر شیرانی، منشی یوسف خاں کے پاس پڑھتے رہے اور فارسی ادبیات میں بہت جلد معقول استعداد بہم پہنچائی۔ شعر و سخن کا بھی ذوق پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد شیرانی صاحب ان کو بھی اپنے ہمراہ لاہور لے گئے

منشی یوسف خاں اور مرزا مصطفےٰ بیگ صاحب کے علاوہ ٹونک میں شیرانی صاحب کے متعدد احباب تھے۔ اور وطن کے اکثر اہل علم و اصحاب عزت و مرتبت سے ان کی شناسائی تھی لیکن جن حضرات سے ان کے گہرے روابط تھے۔ اور جن کے ساتھ ان کی اکثر مجالست و ہم نشینی رہا کرتی تھی۔ ان میں ڈاکٹر ولیم ڈیائی ٹونک کے پرانے مشہور قومی رہنما، ابراہیم خاں سیاح جاپان، وکیل احمد علی خاں، مولانا سید طلحہ میاں، ان کے بھائی مجید عمر میاں، اور ٹونک کے مشہور

تاریخ گو عالم حافظ عبید اللہ البصیر کے نام خاص طور پہ
قابلِ ذکر ہیں۔

شیرانی صاحب چونکہ محققانہ مزاج لے کر آئے تھے۔ مطالعۂ کتب اور علمی و تاریخی موضوعات پر تحقیق و تفحص ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس لئے ان کو اپنے علمی مشاغل سے بہت کم فرصت ملا کرتی تھی یہی وجہ ہے۔ کہ ٹونک میں ان کا حلقۂ احباب محدود ہی تھا۔ ان کے مکان محلہ مہندی باغ میں مخصوص لوگ ہی ان سے ملنے جایا کرتے تھے اور وہ خود بھی خاص خاص لوگوں ہی سے ملنے ان کے مکان پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ مخصوص محافل و تقاریب کے علاوہ ان کی آمد و رفت کہیں نہ تھی۔ لیکن ہر اس شخص سے ٹوٹ کر محبت کرتے اور ملتے تھے جس کے بارے میں انھیں یہ علم ہوتا تھا۔ کہ ادب و تحقیق کا شیدائی ہے۔

البتہ وہ روزانہ شام کو کے وقت ہوا خوری اور چہل قدمی کے لئے شہر کے ہنگاموں سے دور بناس ندی کے کنارے ضرور جایا کرتے تھے۔ اور ساحل بناس پر کھڑے ہو کر اس کے ہاضم و شیریں و سبک و خوش گوار صاف و شفاف شیریں اور بہتے ہوئے پانی اور اس کی چمکیلی ریت کے نظارے سے سرور و کیف حاصل کیا کرتے تھے۔

ز شوق تماشائے گلہائے تر — بہ نظارہ ہر دم نظر تشنہ تر

اور بقول شاعر رومان اختر شیرانی مرحوم

وہ سرد اور مصفّا بناس کا پانی — شراب سے نہیں کچھ کم اگر شراب نہیں

برنگ زلف پریشاں وہ موجِ بادِ رواں — کہ جن کی یاد میں راتوں کو نکر خواب نہیں

ہندوستان کے مشاہیر شعراء، ادباء اور مصنفین میں اکثر سے ان کے قریبی، بے تکلفانہ اور برابر سرابر کے تعلقات تھے اور وہ سب لوگ ان کی علمی و تحقیقی خدمات کو قدر و منزلت سے دیکھتے تھے اور ان کے مجتہدانہ کمال و اعلیٰ صلاحیت کے قائل تھے۔

مرحوم جب لاہور کو خیرباد کہہ کر اپنے آبائی وطن ٹونک واپس تشریف لے آئے۔ اور بقیہ زندگی ٹونک میں گزارنے کا فیصلہ فرمایا۔ تو ان کی تمام علمی، ادبی سرگرمیوں کا مرکز بھی ٹونک بن گیا تھا۔ ان سے ملنے اور ان کی اعلیٰ صلاحیتوں نیز معلومات سے استفادہ کرنے ہندوستان کے مشاہیر ارباب علم وادب اور طالبان تحقیق وتنقید اکثر ٹونک آتے رہتے تھے۔

چنانچہ مئی ۱۹۴۳ء میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، ان سے ملنے ٹونک تشریف لائے۔ بابائے اردو کی شخصیت، اردو دنیا کی ایک معروف ومقتدر شخصیت تھی۔ مرحوم نے ان کی مہمان داری بڑے اعزاز واکرام سے فرمائی۔ سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ان کے قیام کا انتظام کرایا۔ اور ان کے اعزاز میں ادبی مجلسیں، مشاعرے اور محفلیں آراستہ کیں ٹونک کے ادباء وشعراء اور یہاں کے علماء اور دانشوروں سے انھیں متعارف کرایا۔ اور اپنا لگایا ہوا باغیچہ بھی دکھایا۔ بناس ندی پر ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ ان کے قیام کے لئے خوبصورت دو سیع خیمہ کا انتظام کیا۔ اور رات کے لئے ندی کی پُرکیف فضا میں چوکیوں اور چاندنی کا فرش۔

مولانا عبدالحق کے اعزاز میں جو جلسے، مشاعرے اور دعوتیں شیرانی صاحب اور شیرانی صاحب کے باذوق احباب نے کیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر ۱۹۴۳ء کی ایک پرانی ڈائری میں ملا ہے۔ وہ درج ذیل ہے۔

۲۰ر مئی ۱۹۴۳ء۔

"آج معلوم ہوا کہ انجمن ترقی اردو کے صدر مولانا عبدالحق صاحب، مولانا محمود شیرانی کے مہمان ہو کر آئے ہیں۔

کل ان کے اعزاز میں ڈاکٹر نقوی کے یہاں مشاعرہ تھا۔ آج صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب ضابطہ کے یہاں مشاعرہ تھا جس میں مولانا عبدالحق بابائے اردو نے تقریر کی ـــــ مشاعرہ ساڑھے گیارہ بجے ختم ہوا مجلس مخصوص اور مختصر۔ لیکن بڑا کامیاب اجتماع تھا۔ طلباء علی گڑھ نے، ایک سو ایک روپیہ مولانا عبدالحق کو عمارت

قند" میں پیش کئے۔ بسمل صاحب نے بڑی بہترین نظم " اردو" پر اور مولانا موصوف کی اردو خدمات و ایثار و قربانی پر پڑھی جو نہایت کامیاب رہی۔

شیرانی صاحب نے بناس کے ساحل لکمراج گھاٹ پہ بابائے اردو کے اعزاز میں بڑی پُرتکلف دعوت کا انتظام کیا جس میں ٹونک کے شیریں اور لذیذ خربوزے خصوصیت سے ڈاکٹر صاحب کو کھلائے۔ دعوت میں شہر کے معززین اور آفیسران ریاست بھی شریک تھے۔"

یہ ڈائری، ٹونک کے ایک بزرگ خوش نویس اور صحافی منشی عتیق اللہ خاں مرحوم کی خود نوشت ڈائری ہے جو ان کے ورثاء کے پاس محفوظ ہے۔ منشی جی مرحوم بھی اس گروہ اور جماعت سے تعلق رکھتے تھے جس کا ۱۹۲۱ء کی تحریک کے سلسلہ میں اخراج ہوا تھا۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب اس وقت " اردو لغت " کی ترتیب و تسوید کا کام کر رہے تھے اور اسی کی تکمیل و تالیف کے سلسلہ میں شیرانی صاحب کی خدمات حاصل کرنے ٹونک تشریف لائے تھے۔ غالباً ڈاکٹر صاحب نے انجمن کی جانب سے بطور معاوضہ چار سو روپے ماہانہ وظیفہ دئے جانے کی پیش کش کی تھی۔

چنانچہ یہ وظیفہ، شیرانی صاحب کچھ سال لیتے رہے۔ لیکن شیرانی صاحب ایک قناعت پسند انسان تھے۔ انھوں نے خود ہی اس وظیفے میں یہ کہہ کر تخفیف کرالی۔ کہ میں اس مقدار میں کام نہیں کر سکتا جس مقدار میں مجھے وظیفہ دیا جا رہا ہے اس کو ختم کیا جائے لیکن ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر بجائے چار سو کے صرف دو سو روپے وظیفہ لینا قبول کیا۔ دیانت داری، انصاف پسندی اور سیر چشمی کی اس قسم کی مثالیں بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

علمی اور دماغی قابلیت کے ساتھ ساتھ شیرانی صاحب جن ذاتی خوبیوں اور خصائل کے حامل تھے ایسے بہت کم انسان ہوتے ہیں۔ انھوں نے متانت و سنجیدگی کے ساتھ طبیعت نہایت شگفتہ پائی تھی۔ چہرے پر خود اعتمادی، طباعی اور ذہانت کی جھلک تھی۔ ان کے اخلاق نہایت وسیع تھے

بڑے باوضع، پابند اوقات اور ملنسار تھے۔ چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کی عزت کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی و قدر شناسی میں کبھی کوتاہی نہ کرتے تھے۔ ان کی باتیں نہایت عالمانہ، پُرلطف اور معلومات سے لبریز ہوتی تھیں۔

شیرانی صاحب مرحوم کو میں نے صحیح معنیٰ میں ہوش کی منزل میں آنے کے بعد ان کی تصانیف ہی کے آئینے میں دیکھا ہے۔ اگرچہ ان کا نام نامی بچپن ہی سے کانوں میں پڑا ہوا تھا۔ اختر صاحب سے اور خال محترم مولانا حکیم سید ظہیر احمد صاحب برکاتی کے درمیان بہت ہی قریبی دوستانہ تعلقات تھے اور ان کے اور ہمارے خاندان کے باہم رشتۂ خلوص و یگانگت قائم تھا۔ اس لئے وہ ٹونک کے زمانۂ قیام میں اکثر ہمارے یہاں آتے رہتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ تو ماموں جان نے پروفیسر صاحب کی، ہدایت پر "اختر صاحب" کو اپنے مردانے "شفاء منزل" میں مقید بھی کر دیا تھا۔ کہ وہ آزاد نہ پھریں اور اپنے "شغل" سے بچے رہیں۔

لیکن شیرانی صاحب کے دیدار سے آنکھیں دو ایک بار ہی روشنی حاصل کر سکیں اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وہ لاہور کی مصروف زندگی کو خیرباد کہہ کر ٹونک آگئے تھے اور اب یہاں ہی زندگی کے بقیہ ایام گزار رہے تھے۔

ماموں جان، نواب صاحب کے طبیب خاص تھے اور ان کی سواری کے لئے نواب صاحب کی جانب سے "بگھی" متعین تھی ایک دن وہ "بگھی" میں سوار ہونے لگے تو مجھے بھی ساتھ بٹھالیا۔ میرے رفیق درس اور حبیب لبیب قاضی جی (مولانا سید قاضی الاسلام صاحب) بھی اس وقت موجود تھے۔ ان کو بھی ساتھ لے لیا۔ اور فرمایا۔ چلو اختر کے یہاں چل رہے ہیں۔ ان کے والد سے تمہیں بھی سلام کرا لاؤں۔

ہم اختر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ تو اختر صاحب تو تھے نہیں، پروفیسر صاحب اتفاق سے باہر ہی، مکان کے دروازے سے متصل بچھے ہوئے تخت پر تشریف فرما تھے۔ ماموں جان کو دیکھ کر بڑی ہی خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا۔ خیر و عافیت پوچھی۔ اپنی نبض دکھائی۔ ماموں جان نے نسخہ لکھا

دوا تجویز کی - اس کے بعد اختر صاحب کی بے راہ روی اور گھر سے غائب ہونے کا ذکر نکل آیا۔ پروفیسر صاحب نے بڑے شدید دردمندانہ اور مایوسانہ تاثر کا اظہار کیا۔

ہمارا تعارف ہوا تو بڑی محبت و شفقت سے ہماری تعلیم کے بارے میں دریافت فرمایا - دعائیں دیں تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم چلے آئے - یہ یاد نہیں پڑتا - کہ انھوں نے اس وقت کچھ کھلایا پلایا بھی - بہت عرصے کی بات ہوگئی - اس کے بعد جہاں تک مجھے یاد آرہا ہے - ایک آدھ بار سرراہے ان کو اپنے تانگے میں سوار کہیں آتے جاتے دیکھنے کا اور موقعہ ملا تھا - پھر کچھ دنوں بعد سنا - ان کا انتقال ہوگیا -

وہ دمہ کے تو دائمی مریض تھے ہی، اپنے کسی کام کے سلسلہ میں ٹونک سے باہر غالباً جے پور گئے ہوئے تھے، بارش ہوگئی جس کی وجہ سے موسم کافی سرد ہوگیا تھا - ان پر اچانک نمونیہ کا حملہ ہوا، اور اس موذی مرض کی تاب نہ لاکر یہ باکمال، ہمارے ادب کی محفل کو ہمیشہ کے لئے سونی کر گیا - خداوند کریم جنت الفردوس میں ہر آن ان کے درجات بلند فرمائے - آمین -

انھیں ہم سے جدا ہوئے پورے چونتیس سال ہو چکے ہیں - اس عرصے میں دنیا میں بڑے بڑے انقلاب آئے - ذہنی، سماجی اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ٹونک بھی ان انقلابات اور تداولِ ایام کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا اور شیرانی صاحب کی وہ جنم بھومی، جسے راجستھان کے سنگستان میں ایک علمی نخلستان کی حیثیت حاصل تھی اور جو ایک عالم کا مرجع و مآب اور علم و ہنر کا مخزن تھا - آہ ——— اب وہ اس اعتبار سے اجڑ سا گیا ہے -

دست صیاد نے ہمارے اس چمنستان کے اس اہتمام سے نقشے بدلنا شروع کر دئے ہیں - کہ ہمیں محسوس تک نہ ہو - اس کی خصوصیات ایک ایک کر کے ختم ہوتی جارہی ہیں - اس کے عالم اس کے حکیم، اس کے ادیب اور اس کے شاعر نوبت بہ نوبت اٹھتے چلے گئے - اور اب ایک سناٹا ہے - اور بقول اکبر الہ آبادی :-

وہ ہوا نہ رہی، وہ چمن نہ رہا، وہ گلی نہ رہی، وہ حسین نہ رہے -
وہ فلک نہ رہا، وہ سماں نہ رہا، وہ مکاں نہ رہا - وہ مکیں نہ رہے

اس کے حسین وخوبصورت باغ ویران ہیں۔ اس کے عالی شان محلوں پر غیروں کا تسلط ہے نہ اب وہ مکاں ہیں اور نہ وہ مکیں۔ اس کی گلیاں، اس کے در و بام، دیوار و در اب اجنبی ہوتے جا رہے ہیں اس کے مدرسے اداس ہیں، اس کی روایات، اس کی تہذیب دھیرے دھیرے فنا ہو رہی ہیں۔

ٹونک ہمارے بزرگوں کے خواب کی حسین تعبیر تھا، اس کے ہر ذرۂ خاک سے انھیں انس تھا پیار تھا۔ اور وہ اس کے شیدائی تھے — یہاں انھوں نے علم و حکمت کے دریا بہائے ہیں۔ اس کے نام کو بلند کیا ہے، تشنگان علوم کو سیراب کیا ہے۔ ہم ان کے اخلاف ہیں، ان کے ورثہ کے امین و محافظ ہیں "تذکرۃ الاسلاف تبصرۃ الاخلاف" کے پیش نظر، اسلاف کے علمی ادبی کارناموں اور ان کی اولوالعزم و باکمال ہستیوں سے موجودہ اور آنے والی نسلوں کو متعارف کرانا ہمارا فرض ہے۔ تاکہ وہ جان لیں ب— کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے ہم۔

اسلاف کے کارناموں کا بیان، ان کی علمی، ادبی اور فنی خدمات کا تذکرہ انشاءاللہ ہمارے لئے اور آنے والی نسلوں کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوگا۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ پروردگار عالم ہماری اس سرزمین کو پھر وہی زرخیزی اور نمی عطا فرما۔ اور پھر یہاں سے کوئی محمود خاں شیرانی، کوئی علامہ برکات احمدؒ، کوئی علامہ حیدر حسن خاں اور کوئی مولانا محمود الحسن پیدا ہو — ؎

ہاں دکھا دے اے مقدر پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

۵ اکتوبر ۱۸۸۰ء پروفیسر صاحب کی تاریخ پیدائش ہے۔ ۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ان کی جگر کاوی، و جانفشانی، اور بالغ نظر تبحر علمی کا ارباب علم و اصحاب تحقیق نے کیا صلہ دیا۔ ان کی تخلیقات و تالیفات سے کس قدر استفادہ کیا۔ ان کی یاد کو باقی رکھنے کے لئے کیا قدم اٹھایا؟

ان سب کا جائزہ لینے، اور ان کے، ان علمی و تحقیقی جواہر پاروں کو جو اب تک کسی وجہ سے منظر عام پر نہ آسکے ہیں۔ منظر عام پر لانے کی غرض سے نیز آنے والی نسلوں کو ان کے گرانقدر علمی کارناموں سے واقف کرنے

کے مقصد سے ہمارے پڑوسی ملک میں صد سالہ یاد منائی جارہی ہے۔

یہ خبر ہند و پاک کے علمی حلقوں اور خاص طور پر اہل ٹونک کے لئے مسرت و شادمانی کا سبب اور فخر و مباہات کا باعث ہے۔ کہ ان کے شہر کے ایک یگانۂ روزگار، قابل صد افتخار فرزند کی خدمات علمی اور اعلیٰ کارناموں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے قومی و ملّی علمی و ادبی سطح پر صد سالہ جشن کا اہتمام ہو رہا ہے۔ خداوند کریم ارباب علم و تحقیق کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور پروفیسر محمود شیرانی کی علمی یادگار قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے

شیرانی صاحب مرحوم کے پوتے، مظہر محمود شیرانی ان کی علمی میراث کے صحیح وارث اور جانشین ہیں وہ خود بھی صاحب علم و فن اور قلمکار ہیں۔ علم پدری کی حفاظت و اشاعت کے صحیح طور پر ذمہ دار و مستحق۔

امید ہے کہ ان کی سربراہی میں "حضرت حافظ محمود شیرانی مرحوم" کی جامع کمالات شخصیت کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل، معلومات افزا، مضامین و مقالات لکھے جائیں گے اور وہ کتابی صورت میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر قدردانان شیرانی مرحوم، اور طالبان علم تحقیق کے ہاتھوں تک پہنچیں گے۔

ٹونک کے دانشوروں، ارباب ادب اور شیرانی خاندان کے قدردانوں نے بھی یہ عزم کیا ہے کہ وہ بھی اپنے وطن کے بالغ نظر محقق کے "جشن صد سالہ" کی تقریبات پورے سال تک منائیں گے اور ایسی یادگار قائم کریں گے کہ جس سے ان کے کارنامے اور ان کا نام قیامت تک باقی رہے اور تشنگانِ علوم سیرابی حاصل کرتے رہیں:۔

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

۵ر اکتوبر ۱۹۸۰ء